اردو ناول میں مابعدنو آبادیاتی اور استعماری بیانیہ

نازیہ پروین
طاہرہ اقبال

Abstract:

Post colonialism is the discourse of understanding and interpretation of literary texts in the societies emerging from the colonial system of the Western imperialism. Their central concern is the reiteration of lost and dwindling cultural indigeneity. This article explores the issues of the imperialist and postcolonial narratives in Urdu novel in the light of the postcolonial discursive strategies theorized by Edward Said. Garaan, Khas-o-Khashaak Zamanay, Zeno, Qala Jangi, Ghulam Baagh, Zena, and Mantaara have been analyzed from this postcolonial perspective.

مابعدنو آبادیاتی بیانیہ مغربی استعمار کے نظامِ نو آبادیات کے تحت تشکیل پانے والے معاشروں میں ادبی متون کی تفہیم کا ڈسکورس ہے جس کا اسی موضوع گمشدہ اور مٹتی ہوئی تہذیبی وثقافتی مقامیت کی باز دید ہے۔ایڈورڈ سعید نے جن مابعدنو آبادیاتی حربوں اور کلامیوں کی نشاندہی کی تھی،ان کی روشنی میں اُردو ناول میں مابعدنو آبادیاتی اور اِستعماری بیانیہ کے مباحث پیش کیے گئے ہیں۔''گراں''،''خس و خاشاک زمانے''،''زینو''،''قلعہ جنگی''، ''غلام باغ''،''زینہ''،''منتارا''میں مابعدنو آبادیاتی رویوں کے زاویہ ہائے نظر اور متعلّقہ مسائل کو اِسی خاص فکری تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔

نو آبادیات مشرقی پیمانوں کو مغربی معیاروں کے تناظر میں جانچنے کا نام ہے۔ان معیاروں پر تخلیق ہونے والا مقامی ادب وثقافت پر اثرات کا مطالعہ مابعدنو آبادیاتی بیانیے کا نام دیا جاتا ہے۔استعماری طاقتوں نے مقامی آبادی کو ذہنی غلام بنالیا۔اس کے زیرِ اثر مقامی باشندے اپنی تہذیبی وثقافتی روایات،تمدن اور رسم ورواج کو فرسودہ سمجھنے لگے۔استعماریت نے سیاسی حکمت عملی کے ذریعے مقامی ذہنوں میں شاطرانہ انداز میں مادیت کی، الیکٹرونک میڈیا کی چکا چوند نے جن اقدار سے بےزاری پیدا کی وہ مقامی تہذیبی وثقافتی اقدار ہی ہیں۔

ایڈورڈ سعید نے نو آبادیات اور استعمار کے لیے''بالا دست''اور''زیردست'' کی اصطلاحات کو''تقسیم'' اور''امتیاز'' کے تصور سے وضاحت پیش کی ہے۔جب دُنیا میں طاقتور حکومتوں کے پاس معاشی وسائل ختم ہونے لگے

تو انھوں نے قریبی علاقوں پر جنگ و جدل اور فتوحات کے ذریعے ان کے معاشی وسائل پر غلبہ پا کر اپنے دست نگر کیا اور طاقت کے زور پر جبری محکوم بنا لیا۔ ہندوستان میں انگریز نوآبادیات نے اپنے استحکام کے لیے خاص ڈسکورس واضح کیے۔اس ڈسکورس کی اشاعت و ترویج ادبی انجمنوں، تعلیمی اداروں اور ادبی کتب کے تراجم کے ذریعے کی۔ اردو ناول میں مابعد نوآبادیاتی اور استعماری بیانیہ قومیت پرستی، نسل پرستی، مفاہمت و مزاحمت، احتجاج، شعوری کشمکش تہذیبی تصادم، شخصی امتزاج جیسے بیانیے اردو ادب میں وجود پانے لگے۔نوا؟ بادیاتی اور استعماری طاقتیں ہر دور میں رہی ہیں۔اس کرۂ ارض پر قوموں کی تباہ و بربادی کی خونی داستانیں تاریخ کے دبیر پردوں میں چھپ گئیں۔کس طرح نوآبادیاتی اور استعماری بیانیے نے قوموں کو نیست و نابود کر دیا۔وجود کیسے کھنڈرات میں تبدیل ہوتے ہیں۔

فرانز فینن اور ایڈورڈ سعید نے جن مابعد نوآبادیاتی حربوں، بیانیوں اور کلامیوں کی نشاندہی کی تھی۔اس کی عملی صورت ''گراں'' کے مابعد نوآبادیاتی بیانیے میں نظر آتی ہے۔جو عالمگیریت کی یلغار میں گراں کی ٹوٹتی ہوئی ثقافت کا نوحہ ہے۔ادب کسی بھی معاشرت کی تہذیبی بنیادوں میں زندگی کا اصل عکاس ہوتا ہے۔ مابعد نوآبادیاتی بیانیے میں ثقافتی عناصر کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔تاکہ مابعد نوآبادیاتی باسیوں میں اپنی مقامی معاشرت، زبان، رسوم و رواج کی بازیافت کا خیال اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔عالمگیریت کا مرکزی ہدف ترقی پذیر ممالک کی مقامی ثقافتیں مٹا کر پوری دُنیا کو ایک عالمی گاؤں بنانا ہے۔ایسی صورتِ حال میں ایک ادیب کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ ادیب کو تاریخ، تہذیب اور ثقافت کا امین سمجھا جاتا ہے۔طاہرہ اقبال نے ایک ادیب ہونے کے ناطے یہ ذمہ داری خوب نبھائی ہے۔وہ پوٹھوار کی مقامی ثقافت کو اپنے ناولوں کے بیانیوں میں سمیٹ کر پوٹھوار کے شان دار ماضی اور ثقافتی شناخت کی اہمیت اُجاگر کی ہے۔

''گراں'' ان تمام مذکورہ احوال کا مستحکم بیانیہ ہے۔ مابعد نوا؟ بادیاتی بیانیے کی ''گونج گراں'' کے کینوس پر نمایاں ہے۔اس Irony کے تصور کو ''گراں'' کے استعماری بیانیے میں پیش کیا گیا ہے جب گراں کے مقامی لوگ روزگار کے لیے بیرونی ممالک میں گئے تو وہاں انگریزوں کی تہذیب و ثقافت، زبان، عادات و اطوار اور جدید علوم اور بنیادی ضروریاتِ زندگی سے اس قدر متاثر و مرغوب نہ ہوئے جتنے ڈالروں کی چکاچوند نے مقامی نئی نسل کو متاثر کیا۔ مادیت پرستی نے خوش حالی اور ترقی کے نئے در وا کیئے۔ ''گراں'' کے بیانیے میں مرکز و معروض اور موضوع کی یکجائی سامنے آئی ہے۔

> ''اس گراں میں عجب تبدیلی آئی تھی کہ ان پڑھ لڑکیوں سے پلو چھڑا کہ بھاگ نکلنے والے لڑکے اب خود ان پڑھ رہنے لگے۔لڑکیاں ایم۔اے، ایم۔بی۔اے اور لاء جیسی بھاری بھرکم ڈگریاں حاصل کر چکی تھیں۔''[۱]

ڈالروں کی کمائی نے نئی نسل کو عیاش بنا دیا تھا۔ وہ ولائتی کمائی پر اتراتے ہوئے بے دریغ پیسہ اڑاتے، لگژری گاڑیاں خریدتے، سیر و تفریح پر شمالی علاقہ جات کے ٹورز کرتے۔ ہوٹلوں میں مرغے چرغے اڑائے جاتے۔

مہنگے برانڈ کے لباس زیب تن کیے جاتے۔ ولایت میں جانے کی وجہ سے شہروں سے پہلے مہنگی اور بڑی ایجادات، ٹیلی ویژن، ڈش انیٹنے، فریج نئی طرز کے الیکٹرونک چولہے موڈرن لباس گراں کے مکینوں تک پہنچ چکے تھے۔ رہن سہن کا انداز بدلا، طور وطریقے بدلے اور زبان و بیان بھی بدل گیا۔

''ولایت کی کمائی بھیجنے والے فرنس آئل بچانے کی تگ و دو میں ایک ہی کمرے کے طویلے میں جانوروں کی طرح برفیلی راتوں میں منجمد ہونے عمر بھر انگریزی...... بول نہ پائے......لیکن یہاں یہ دیہاتی لڑکیاں فرفر انگریزی بولتیں۔''۲

مذکورہ مثالوں کی طرح اور بھی بے شمار مثالیں گراں میں موجود ہیں جو اس کے مابعد نوآبادیاتی بیانیے کا پتہ دیتیں ہیں۔ کہ کیسے مغربی یلغار کے نتیجے میں انسان اپنا نام، اپنی پہچان اور اپنی زبان تک بدل لیتا ہے۔ ناول کے کردار محمد نذیر احمد نے خود کو NZD بنا لیا اور یورپ کی رنگینیوں میں کھو گیا۔ عمر بھر اُسے اپنی مٹی کی یاد آئی نہ پیچھے رہ جانے والوں کی خیر خبر لانے والے خطوں کو کھولا۔ مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب کے ملاپ نے ایک جنوں خیز نسل کو پیدا کیا جو تمام تر مغربی حوالوں کے باوجود NZD کو تنہا چھوڑ گئی۔ تنہائی کی شدت نے ماضی کے مدفن کی بازیافت کی۔ NZD کے پاس بچ جانے والی مشرقی تہذیب وثقافت کی روداد جو سر بہ مہر لفافے کئی سالوں سے کئی راز پڑھے جانے کے منتظر تھے۔ جن پر بدلتی تاریخیں، بدلتے وقت کی ٹکٹیں اپنی اپنی کہانیاں پیش کر رہی تھیں۔

''ان ٹکٹوں میں کیا کچھ موجود نہ تھا۔ وطنوں کے سارے اہم دن، تاریخ جغرافیہ، سیاست سے کھیل تک ساری تاریخ درج تھی۔ ان خطوط میں گاؤ?ں کے ہر خاندان کے حالات......بھینس گائے کے بیانے سے لے کر کسی انسان کے فوت ہونے تک مویشیوں کے مرنے سے لے کر ان کے بچھڑوں کٹڑوں کی پیدائش اور ان کی نسلوں تک کی تفصیل موجود تھی۔''۳

خطوط مٹتی ہوئی مشرقی تہذیب وثقافت کا استعارہ تھے جو محمد نذیر احمد کا تعلق وطن کے مکینوں سے جوڑتے تھے۔

''خس و خاشاک زمانے'' میں ۱۱/ ۹ کے بیانیے کی گونج بڑی شدت سے سنائی دیتی ہے۔ ۱۱/ ۹ کا بیانیہ درحقیقت استعماریت کا اعلانیہ ہی ہے۔ کہ کیسے پل بھر میں کھلے آسمان تلے فلک بوس عمارتیں زمین بوس ہوگئیں اور وجودی جسم کاغذی پتنگوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگے۔ مستنصر حسین تارڑ نے مابعد نو?آبادیاتی اور استعماری بیانیے کی کریہہ صورت کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

''یہ منظر ایسے تھے جیسے کوئی سحر پھونک کر اُن کو تخلیق کر دیا گیا ہو۔ ورلڈ ٹریڈ ٹاورز کی جڑواں عمارتیں یکے بعد دیگرے انتہائی بے بسی سے اپنے قوموں پر زمیں بوس ہو رہی تھیں......اُن متکبر بلندیوں کی تنگ کھڑکیوں میں سے گدے چھلانگیں لگاتے لڑھکتے ہوئے چلے ا?رہے تھے۔''۴

ناول میں اس آفاقی بربریت سے معمور اقدام کی طرف بلیغ اشارے کیے گئے۔ کہ انصاف کرنے میں کچھ وقت درکار ہے۔ مگر استعماری طاقتوں نے محض اٹھائیس دنوں بعد ہی انتقامی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ عراق، شام، لبنان اور افغانستان پر حملوں کے متعلق گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ مگر عقیدوں کے فرعون ٹیکنالوجی کی بے رحمانہ یلغار کے سامنے خاموش تماشائی ثابت ہوئے۔ وہ ملک جو پہلے ہی کھنڈرات کا منظر پیش کرتے تھے مزید کھنڈرات میں ڈھنستے چلے گئے۔ اُسامہ بن لادن کی آڑ میں صیہونی طاقتوں کو تیسری دنیا پر یلغار کا موقع مل گیا۔ جس میں ایٹمی حملوں سے لے کر معاشی، اقتصادی، نظریاتی ہر طرح کی قہرناکی شامل تھی...... بقول مصنف:

''ایک چیونٹی کو ہلاک کرنے کی خاطر سینکڑوں مشتمل ہاتھی چیختے چنگھاڑتے چلے آتے تھے اور اپنیر استے میں آنے والی ہر بستی اور ہر صحرا کو روندتے چلے آتے تھے۔''۵

اس استعماری بیانیے کے بعد مشرقی دنیا وہ نہیں رہی جو کبھی تھی اور جو نئی دنیا کا وجود دریافت ہوا۔ اس میں ایک طرف وحشت ناکی، بھوک، افلاس۔ تو دوسری طرف عیاشی، جنسی اشتہا نے ذہنوں کو کند کر دیا۔ ''چینی جو میٹھی نہ تھی'' میں صفدر زیدی نے ۱۸۳۳ء کے عہد میں ایسٹ انڈیا کی کارروائیوں کے متعلق استعماری رویوں کو بیانیے میں جگہ دی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے وابستہ تاجروں نے ہندوستان کی زرخیز زمینوں کو کیسے اپنے مفاد اور تجارتی عرض کے لیے منصوبہ بندی سے ویران اور بنجر کیا۔ یورپ میں کارخانے لگنے کے بعد ہندوستان میں تیار ہونے والے کپڑے پر بھاری ٹیکس لگا کر مارکیٹ میں اتنا مہنگا کر دیا جاتا کہ کوئی خریدار نہ ملتا۔ لہٰذا سوچی سمجھی سازش سے ایک ایک کر کے کارخانوں کو بند کیا جاتا رہا، اور کپاس کی فصل کاشت کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ کسانوں کو صرف نیل اور افیم کی فصل کاشت کرنے کی اجازت تھی۔ اس کی اچھی قیمت نہ ملتی کم داموں پر کمپنی ہی اسے خریدتی۔ استعمار کی کریہہ شکل غلامی کے آئینے میں واضح ہوتی ہے۔ یہ نظریات سوچ، عقائد اور افرادی طاقت کی شکل میں بھی ہو سکتے ہیں۔

غلامی اور استعمار ایسے شکنجے ہیں۔ جو قوموں کے ذہنوں سے ثقافت، ا? رٹ، تہذیب اور علم و آگہی کے خزانوں کو پامال کرتے ہیں۔ زندگی کا دائرہ تنگ سے تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر انسان کا پیٹ خالی ہے تو اس میں حکمت و دانش اور فنون لطیفہ کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ بھوک جنس کی ہو یا اناج کی دونوں صورتوں میں خطرناک ہے۔ بھوکے انسان کو سوائے روٹی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسی حالت میں علم و دانش، فکر و موسیقی اس کے لیے یہ سب چیزیں بیکار ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی اور استعماری بیانیہ ان رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔

اناج کی پیداوار کم ہونے کی وجہ سے قحط سالی بڑھنے لگی۔ لوگ اور مویشی خوراک نہ ملنے پر بھوک سے مرنے لگے پہلے جو کارخانے، مقامی کپاس سے کپڑا بناتے تھے۔ بند ہونے پر ایسٹ کمپنی نے خریدے اور نیل کا کاروبار شروع کیا۔ اس صورتِ حال سے موت اور بیماری نے گاو?ں کے گاو?ں خالی کرنا شروع کر دیئے۔ مقامی کسانوں کو اس حالت زار نے ایسٹ کمپنی کے خلاف کر دیا۔ انھوں نے انگریزوں کے لگائے ہوئے نیل کے کارخانوں کو جلا دیا۔ تاریخ میں اِسے نیلی بغاوت کا نام دیا گیا۔ جو پٹنہ سے مرشد آباد تک پھیل گئی۔ انگریز کمپنی نے

اس بغاوت کو کچلنے کے لیے متعلقہ لوگوں کے گھروں کو جلا دیا اور انھیں گرفتار کرتے ہی پھانسی دے دی گئی۔ اس استعماری صورت حال میں کسانوں میں بغاوت کی مخالفت کی سکت نہ رہی۔ انگریزوں نے اپنے راج کو مضبوط کرنے کیلیے ہر گاؤں میں اپنے دلال چھوڑ رکھے تھے۔ جن کا کام گاؤں کے مکھیا جی یعنی چودھری کو انگریز سرکار کی عطایات اور مہربانیوں کا یقین دلانا ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ انگریزوں کے ایجنٹ ان چودھریوں کے خاص آلہ کار بنتے چلے گئے، اور کمزور کسانوں کو روپے پیسے کی لالچ میں سُرم نام اور دوسروں ملکوں میں جو یورپی تسلط میں تھے۔ وہاں جانے کے لیے ہندوستان کے گاؤں سے بھوک کے ستائے ہوئے کسان نوجوانوں کو اُکسایا جاتا افریقہ کو آزادی ملنے کے بعد حبشی غلاموں کی جگہ ہندوستانی نوجوانوں کو ہالینڈ، گیانا، مارلیش میں بھیجنے کے لیے یہ سارے منصوبے بنائے گئے۔

> ''غلامی کے خاتمے نے اُن کی چینی کی پیداوار پر منفی اثر ڈالا، انگریزوں اور فرانسیسی تاجروں نے برٹش گیانا اور مارلیش میں حبشی غلاموں کی جگہ ہندوستانی کسانوں سے سستے داموں کام لینا شروع کر دیا تھا۔ سری نام ہالینڈ کی ایسی ہی ایک کالونی تھی جسے ولندیزیوں نے نیویارک شہر کے بدلے میں برطانوی حکومت سے لیا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ بھی ہالینڈ کے بادشاہ ولیئم سوئم سے باہمی تعاون کا ایک معائدہ کر چکی تھی۔''[۶]

ہندوستان سے جانے والے کسانوں سے بےتحاشا محنت طلب کام لیے جاتے مگر اُجرت بہت کم ملتی، اور معمولی معمولی غلطیوں اور کوتاہیوں پر آدھی تنخواہ کاٹ لی جاتی، گاؤں سے باہر کسی کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ کسان قیدیوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ اگر کوئی کسی ضروری کام سے بھی باہر جاتا تو اس کو سخت سزا دی جاتی اور تنخواہ بھی کاٹی جاتی۔ کردار دین محمد کو صرف زمیندار کی طرف دیکھنے پر مار مار کر بےتحاشا زخمی کیا گیا۔ استعماری رویے ہمیشہ تشدد سے تقویت حاصل کرتے ہیں۔

''حبس'' میں حسن منظر نے اسرائیلی قتل وغارت گری، امریکہ اور برطانیہ کی پشت پناہی اور عرب ملکوں کا اتحاد اور خاموشی اور فلسطینوں پر اسرائیل کی فوج کی طرف سے بم باری، زمینوں پر قبضہ اور فلسطینوں کا علاقوں سے انخلا اور دنیا بھر سے یہودیوں کو لاکر اسرائیل کا فلسطینی سرزمین پر غیر قانونی قیام کا سیاسی اور استعماری بیانیہ ناول میں نظر آتا ہے۔ دوسرے ملکوں سے زبردستی لائے جانے والے یہودی بھی اس استعماری دھونس سے پریشان ہیں۔ ''ہم کہاں آپھنسے۔ زندگی ایک مسلسل جنگ کی زد میں ہے۔''[۷]

استعماری طاقتوں کا سربراہ ملک جو خود مہلک ترین ہتھیاروں میں لیس ہو، جس کے پاس بے پناہ ایٹمی طاقت کی فراوانی ہو۔ جس نے تیسری دنیا کو سیاسی چالوں اور نیو ورلڈ آرڈر کے ڈنڈے سے ڈرا رکھا ہو۔ ایسے ملک کے وزیراعظم کا اپنی دماغی حالت اور نفسیاتی حملوں سے بےبس ہو کر کومے میں چلے جانا مکافاتِ عمل ہوسکتا ہے۔ پورے ناول میں انسانی تخیل اور آوازوں کی خود کلامی سے بیانیے کی تشکیل کی گئی ہے۔ ایک احتساب عدالت سا منظر تحریری سطح پر نظر آتا ہے۔ کردار ایریئل جو مفلوج ہو کر مردہ جسم میں دماغی لہروں کی زندگی اور روانی پر زندہ ہے۔ وہ مسلسل سوچ کے دائرے میں فلسطینوں کے قتلِ عام سے خود کو تقویت پہنچا رہا ہے کہ فاشسٹ جرمنی کے گیس چیمبرز کا

حساب بیروت میں چکایا گیا ہے۔ بچوں کے، بوڑھوں کے، عورتوں کے جسمانی اعضاء، خون کے لوتھڑے اور کٹے پھٹے جسم سوچ سوچ کر اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ہی مختلف آوازوں کا ہجوم اُسے ملامت بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ خود کو فرڈینینڈ، نپولین اور ہٹلر کے مد مقابل سمجھتا ہے۔ زمین کا یہ ٹکڑا، نہر سویز اور مڈل ایسٹ پر حکمرانی کرنے کے لیے مغربی دنیا کی طرف سے یہودیوں کیلیے اسرائیل کا تحفہ ہے۔ اس مقصد کے لیے پہلی جنگِ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔ مصنف نے انہی استعماری رویوں کے اظہار کے لیے ''حبس'' کا بیانیہ تشکیل دیا ہے۔

مغرب نے عربوں کو ہی عربی فلسطینی نسل کشی کے لیے چال کے طور پر استعمال کیا۔ ایرئیل کا کردار ایسا استعمار کار تھا جسے ڈائنا مائیٹ، فائرنگ، عمارتوں کو دھماکے سے اڑانا، مرنے والوں کی چیخیں اس کے من پسند مشغلے ہیں۔ اس کا دماغ چیخوں کی Classification سے بھرا ہوا تھا۔ بچوں کی، عورتوں کی، مردوں کی، سب آوازیں اب اس کے دماغ سے بدلہ لے رہی تھیں۔ اس ناول میں فرعونِ مصر سے لے کر تاریخ میں یہودیوں پر ظلم وستم کے سارے استعماری رویے اور روداد اس ناول کے بیانیے میں خود کلامی اور آوازوں کی عدالت کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ اجتماعی شعور کی اتنی پختہ تصویر پینٹ کرنا حسن منظر کی قلم کا خاص وصف ہے۔ کہ کیسے ہٹلر کی بربریت کا بدلہ بچ جانے والے مٹھی بھر یہودیوں نے یہود دشمنوں سے لیا۔ کنگ ڈیوڈ ہوٹل کو بارود سے اڑانا۔ امریکی جہاز اور اقوام متحدہ کی طرف سے امریکی نمائندہ لڑکی کا قتل، سپر پاور امریکہ پر اپنی قوت اور رعب ڈالنے کے لیے اسرائیل نے ہی کیا تھا۔ گزری ہوئی اس صدی کی دو عظیم جنگوں نے محکوموں کو پھر سے حاکم بننے کا ہمیں خوب موقع دیا۔ یہ ساری حکایت ناول کے بیانیے میں نظر آتیں ہیں۔ فلم شوٹنگ کی تکنیکی انداز میں بستیوں کے اجڑنے کے مناظر اور گولیوں کی بوچھاڑ سے گرنے والوں کے سین ایرئیل کی نظروں کے سامنے چل رہے ہیں۔

یہودی جو خود کو رب کی من پسند قوم گردانتے ہیں ان کے نزدیک جارحیت کا سکہ ہی موجودہ دنیا کی طاقت ہے:

> ''ہر نسل کو، بلکہ قوم کو زندہ رکھنے کے لیے ایسا آ ئیڈیل چاہیے ہوتا ہے، اور ہر فرد کو بھی میں جانتا ہوں ہم یہووا کی پسندیدہ چنیدہ قوم ہیں۔''[۸]

موساد Mossad ایک ایسی استعماری تنظیم ہے۔ جس کا مقصد دنیا بھر کے ملکوں میں اسرائیل کے لیے خدمات سرانجام دینا۔ جن ممالک میں اسرائیل کے باقاعدہ دفاتر نہیں ہیں۔ یہ اِن ملکوں میں فال ہے اور خاموشی سے معاشی، اقتصادی اور نظریاتی سطح پر اسرائیل کے لیے رفاہِ عامہ ہموار رکھتی ہے۔ یہ استعماری صورتیں ناول کے بیانیے میں موجود ہیں۔

نوآبادیات کا یہ سلسلہ اتنا قدیم ہے کہ ہر دور میں طاقتوروں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے استعمار کی شکل اختیار کی ہے۔ ہٹلر کے ایک خونی عمل نے پوری صدی کو خونی آندھی سے گہنا کر رکھ دیا ہے، اور اس کا بدلہ اربوں انسانوں سے لیا جا رہا ہے۔ حبس ایسے ہی بیانیے کی نشاندہی کر رہا ہے۔

نوآبادیاتی اور سامراجی قوتیں ہمیشہ مفاد پرستی، استحصالی منطق اور فکر وعلم کا تعبد کرتی ہیں۔ ایک خاص نوع کی استحصالی منطق کو ترویج دینا مقصد ہوتا ہے تا کہ صارفیت اور صنعتی پیداوار کا بازار گرم رہے۔ جس کے لیے افرادی قوت کا مزدوروں کی شکل میں میسر ہونا ضروری ہے۔ سماجیات اور علم بشریات ہی استحصالی وسائل کو تقویت پہنچاتے

ہیں۔لیوی سٹراس نے علم بشریت کو نوآبادیات کی خادمہ قرار دیا ہے۔ادبی بیانیہ کی تشکیل وتعمیر میں اسے بنیادی ماخذ کے طور پر لیا جا رہا ہے۔نائن الیون کے سانحے نے نئے ورلڈ آرڈر کی راہ ہموار کی ہے۔''بادل'' میں اسی تنازعے کے پس پردہ ۱۱/۹ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کیے گئے ہیں۔اس سانحے کے ساتھ دنیا کے مسلمانوں پر صیہونی اوراستعماری طاقتوں کی طرف سے نفسیاتی دباؤ اور مجرم ضمیری میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی۔عراق اور افغانستان پر حملے اس منافرت کا ردعمل تھا۔ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کس نے کیا آج تک حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا۔اس غیر ثابت شدہ جرم کی آڑ میں ہزاروں، لاکھوں بے گناہ موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔اپاہج اور بیواؤں کی زندگیوں کو بوجھ بنا دیا گیا۔اس سانحے کے بعد ہندوستان میں سیکولر حکومتوں کا ہندوستانی مسلمان کے ساتھ رویہ دن بدن بدتر سے بدتر ہوتا گیا۔اس ناول میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

''وار دی جرنلس'' میں صلاح الدین، پرویز ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ٹاورز کی تباہی کو بنیاد بنا کر سپر پاور امریکہ نے افغانستان اور عراق میں پیدا کردہ بھیانک تباہی اور تباہ شدہ زندگیوں کی لاچاری، بےبسی اور مجبوری کو بیان کیا گیا ہے۔اس ناول میں ایرانی فلم ''flycan Turtle'' کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جو عراق جنگ کی ہولناک تباہی کو دکھا کر امریکہ اور دیگر صیہونی اوراستعماری قوتوں کی بربریت کو بےنقاب کرتی ہے۔

''زینو'' میں بھی نوآبادتی اوراستعماری بیانیے کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔یہاں دنیا میں سونے کی مانگ،جنس اور عالمی قدر پر بحث ملتی ہے۔ورلڈ گولڈ کونسل کے پاس سونے کی مقدار، امریکہ، جرمنی IMF بھارت اور پوری دنیا میں پایا جانے والا سونا اور اس کی مقدار پہلی جنگِ عظیم میں جب سرمائے کی مانگ بڑھی تو وسائل کی طلب جنونی حد تک بڑھ گئی۔افراطِ زر کا طوفان، گولڈ سٹینڈرڈ کو متاثر کرتا چلا گیا۔دنیا میں ایک لاکھ پینتالیس ہزار ٹن سونا ہونے کے باوجود سونے کی ہوس ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔''سونا بھی عجیب دھات ہے۔ہزار سال پہلے بھی سونا ایک جنون تھا۔ا?ج کے دور میں ہیجان بن گیا ہے۔''۹

سیاسی استعمارات دنیا کی معیشت کو سونے کے معیار سے تبدیل کر کے کرنسی نوٹوں اور بنک اکاؤنٹس کی شکل میں سامنے لائی ہے اور جس کی وجہ سے تیسری دنیا کی مظلوم عوام قرضے کی چکی میں پستی چلی گئی۔معاشیات اور نفسیات کی لاٹھی جب گنے چنے ہاتھوں میں چلی جائے تو ہمیشہ بگاڑ کا باعث بنتی ہے۔اجارہ داری کی راہ ہموار کرتی ہے۔معیشت، سیاست، آزادی کسی بھی حکومت کی پائیداری کے اہم ستون ہیں جس پر خوف ایک تلوار کی طرح مسلط ہے۔

شہنشاہیت، ملوکیت، استعماریت، سامراجیت، نوآبادیاتی نظام پر ہمیشہ ٹکراؤ کی کیفیت میں رہتی ہیں۔یہ تمام شکلیں عالمگیریت یا ہمہ ارضی کی نمایاں صورتیں ہیں۔یہ صورتیں یہ ہیولے، اِتنے خون خار ہیں کہ انھیں ہر حال میں منافع، سرمایہ اور دولت چاہیے۔اس مقصد کے لیے چاہے معاشرے تباہ و برباد ہو جائیں، تہذیبیں مٹ جائیں، تمدن اُجڑ جائیں مگر سرمایہ زندہ رہے۔خوف کے زیرِاثر سرمایہ کاری کے نئے زاویے جن میں شہوانی، بحرانی، ہیجانی

اور جنون کی کیفیات میں سامنے آتی ہیں۔ جو سرمایہ کی صنعتیں بننے کے مواقع اور راہیں ہموار کرتی ہیں۔ یہ سارے زاویے وبائیں بن کر دنیا پر قابض ہو چکے ہیں اور صارفیت اور کمرشلزم اُنھیں آلات کے طور پر استعمال کر کے اختراعات اور تنوع کی فصل کے اشتہارات لگا کر سادہ لوح عوام کا خون نچوڑ کر سرمائے کے انبار لگا رہے ہیں۔ ناول ''زینو'' میں پال کا کردار ایسا نمائندہ ہے جو معاشروں کے قوانین، اُصول وضوابط کے خونی اور ا؟ہنی درندہ صفت چہروں کو بے نقاب کرتا ہے۔ ان سب تباہ کاریوں نے مل کر زمین کوا؟ لودگی کا ڈھیر بنا دیا ہے: ''تم نے زمین اور اس کی فضا کو بہت میلا کر دیا ہے۔ اتنی گندگی اُچھالنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ زمین سے نکلا ہوا کوڑا کرکٹ ا؟ خر کہاں پھینکا جائے۔''۱۰

دنیا میں بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا قیام اس مقصد کے لیے کیا گیا تھا کہ دنیا میں معاشی ترقی کو متوازن سطح پر رکھا جا سکے۔ مگر صرف چند ملک ترقی کر سکے باقی سب پستی، غلامی اور غربت کے دھارے میں بہہ گئے۔ معاشیات، عمرانیات، طبیعیات، کیمیا، سیاست، اخلاقیات یہ بھی فلسفے کا حصہ رہی ہیں۔ مگر اب سب الگ الگ کارکردگی دکھاتی ہیں۔

''قلعہ جنگی'' میں استعماری بیانیے کی گونج صاف سنائی دیتی ہے کہ کیسے اسلام کی مساواتی تقدس اور نسلِ انسانی کی بقا کے لیے جہادی روح کو عالمی استعمار نے جدید مہارت سے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ طاقت کے اظہار کے لیے قوتِ ایمانی کی آڑ میں کبھی مردِ شجاعت مجاہد بنا تو کبھی اُس کی یہی شجاعت اور مزاحمت نے اسے دہشت گرد قرار دے دیا۔ ''قلعہ جنگی'' ایسے ہی المیے کی جنم گاہ ہے۔ یہاں ہزاروں جانوں کو بم باری سے لاشوں کے انبار میں تبدیل کر دیا اور اِن لاشوں کے اعضاء کھلونوں کی طرح قلعے کے صحن میں بکھرے تعفن پھیلا رہے تھے۔ شعوری اور لاشعوری طاقت پر انسانی دماغ ہی انسانی تجربوں کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ اس ناول میں استعماری پالیسوں کے نتیجے میں مسلمانوں کی جذباتی حالت اور رویوں کی ذہنی سطح، اپنے ملک کی معاشرتی ومعاشی کوششوں کا تجزیہ بھی بیان کیا گیا ہے:

> ''کئی جو سرحد پار سے آئے تھے اس جذبے سے سرشار تھے کہ کفر کو تلوار سے بھی زیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کفر تھا کہ آسمانوں پر ہی اُڑان کر کے چلا جاتا تھا۔ ماسکو والے اگرچہ دہریے تھے لیکن اس کے باوجود اُن میں انتظامی صلاحیتیں ایسی تھیں کہ اُن کے دور افتادگاؤں میں بھی بجلی تھی۔''۱۱

امریکہ اور روس میں طاقت کی بالادستی کی جنگ میں افغانستان میں روسی یلغار کو روکنے کے لیے امریکہ نے پاکستان سمیت دنیا بھر کے ذہنوں کو روس کے خلاف استعمال کیا۔ جب وہ عالمی سپر پاور بن کر اُبھرا تو اپنی جیت کے نقش پا کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے اسی سرزمین پر نسل کشی کرنے کے لیے حملہ ا؟ ور ہوا اور مدد کرنے والے ہاتھ ہی گلہ کاٹنے والے ہو گئے۔

اس ناول میں استعماریت کے دوہرے معیار کوواضح کیا ہے۔جس نے جنوبی ایشیا کے خطے کودرپیش خونی جنگ کے آسیب کے خدوخال مہیا کیے ہیں۔ طالبان کی شدت پسندی اور تنگ نظری نے اسلام کے مساواتی اور پرامن معاشرے کے'' کاز'' کودہشت گرد مذہب کے روپ میں پیش کیا۔ بین الاقوامی استعماری طاقتوں نے میڈیا کی تشہیر کا سہارا لے کر اسلام کے خلاف ناپسندیدگی اورنفرت کے ردِعمل نے جدید ایٹمی ہتھیاروں اورجنگی جہازوں کی صارفیت میں اضافہ کیا۔عرب ممالک کی خودغرضی، ذاتی مفاد، درپردہ استعمار کے اس قلعے کومضبوط بنانے میں مکمل تعاون فراہم کیا۔مطلق العنان بادشاہی حکومتیں اپنی عوام کو بنیادی حقوق دینے کی بجائے اپنے اقتدار کے دوام میں کوشاں رہیں۔عراق میں صدرصدام،مصر میں حسینی مبارک اور لبنان میں کرنل قذافی اور افغانستان میں طالبان کا بھی کچھ رویہ ایسا ہی تھا۔ یہ حقائق نوآبادیاتی نظام کی آڑ میں استعماری طاقتوں کو پھلنے پھولنے کیلیے دعوت عام ثابت ہوئے۔

''غلام باغ''نوآبادیاتی بیانیے کی اہم کڑی ہے۔مابعدنوآبادیاتی نظام نے جوطبقات پیدا کیے ہیں ان کی سوچ وفکر،کش مکش،نظریاتی تصادم کی روبہ زوالی کا منظرنامہ غلام باغ میں بکھرا ہوا ہے۔اس بے ربط و بے ترتیب انسانی شیرازے کوغلام باغ کے کینوس پر سجایا ہے۔مرزا اطہر بیگ نے ایک انٹرویو میں بھی اِن نکات کی وضاحت کی ہے:

> ''انسان کا انسان پرغلبہ حاصل کرنا اوردوسرے انسان کومحکوم بنانا اس ناول میں اسی بات کوموضوع بنایا گیا ہے۔اس کی وسیع تر Dimension کو Explore کرنے کوشش کی گئی ہے......سارا پس منظر اسی غلبہ پانے اور اندھی قوت حاصل کرنے کی خواہشیں پہلے اور پھر ہمارے پوسٹ کلونیک نظام کا پس منظر جو یورپین اقوام کے آنے کے بعد وجود میں آیا اس کے اشارے موجود ہیں۔''[۱۲]

نوآبادکار طاقتیں اپنے مقاصد کے لیے ہمیشہ مقامی باشندوں کومختلف سطحوں،لسانی،معاشی،معاشرتی، تعلیمی اور مذہبی عقائداورفرقہ وارانہ سوچ کو ہوا دے کرمحکوم بناتی ہیں۔جس سے معاشرے میں انتشاراورانحطاط کے دورکا آغاز ہوجاتا ہے۔ بظاہرمعاشرہ ترقی کی راہ پرگامزن ہوتا ہےمگرزیریں سطح پرمعاشرتی نظام میں یگانگت، ذہنی سکون اورنظریات کی ردتشکیل شروع ہوجاتی ہے۔معاشرہ دودنیاؤں میں بٹ جاتا ہے۔نوآبادکاراوردوسری طرف نوآبادیاتی نظام کے تحت محکوم دونوں ایک دوسرے کے اضداد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔رخسانہ بی بی لکھتی ہیں:''نوآبادکاروں نے اپنی شخصیت، اپنی ثقافت، اپنے عملی ورثے اوراپنے سیاسی نظریات کے ذریعے نوآبادیاتی افراد کی تہذیب وثقافت کو بےدخل کرنے کی کوشش کی۔''[۱۳]

نوآبادکاراس نظام کے تحت طبعی، زمینی،نظریاتی اوراقتداری ہرسطح پر بیک وقت تبدیلیاں رونما کرتا ہےاور محکوم اپنے ہی دنیا میں دوسرے کے لیےاشاروں کےمطابق بظاہرآزاد حالت میں مگرذہنی طور پر پابندوسلاسل ہوکر

واضح کیے گئے نظامِ زندگی اور اصولوں کے مطابق جینا شروع کر دیتا ہے۔محکوم دنیا کا تصرف خود بخود نوآبادکاروں کے ہاتھوں کٹھ پتلیوں کا سا بن کر رہ جاتا ہے۔

نوآبادیاتی باشندہ یا تو پیدا شدہ صورتِ حال کے مطابق نوا؟ بادیاتی نظام کا ماتحت ہو جاتا ہے یا پھر باغی نظریات کا داعی بن کر ابھرتا ہے مگر قید و بند دونوں صورتوں میں اس کا مقدر ہیں۔ناصر عباس نیّر کے مطابق:

''انجذاب کے عمل میں نوآبادیاتی باشندہ نوآبادکار کی زبان سیکھتا ہے۔اس کا لباس اختیار کرتا ہے اس کے طرزِ بود و باش کی نقل کرتا ہے۔نقل وتقلید میں وہ جتنا آگے جاتا ہے۔اپنی تاریخ، ثقافت اور اپنی اصل سے اتنا ہی دور چلا جاتا ہے۔''[۱۴]

نسلِ انسانی ہر دور میں چند مقبرین طاقتوں کے سامنے بے بس رہی ہے۔انسان کا انسان پر ہی غلبے کی خواہش اور طبقاتی کشمکش اس ناول کا اہم حوالہ ہے۔یاور عطائی، امبر جان، نواب ثریا، جاہ نادر جنگ جیسے کردار غلبے کی خواہش میں ہر انتہا تک چلے جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ڈاکٹر ناصر، کبیر مہدی، زہرہ کے کردار مابعد نوآبادیاتی نظام کے باغی کے طور پر سامنے آتے ہیں۔استعماری طاقتیں کب ذہنوں کو آزادی سے سوچنے دیتی ہیں۔کبیر مہدی کی باغیانہ سوچ اور خیالات ہی اس کی موت کے پروانے بن جاتے ہیں۔کبیر کی موت صداقت اور اظہارِ حقیقت کی موت ہے۔استعماری طاقتیں غلاموں اور محکوموں کو ہمیشہ ایسے ہی المیے سے دوچار کرتی رہتی ہیں۔سفیر حیدر لکھتے ہیں:''یہاں اپنے خواب کی اُنگلی پکڑ کر چلنے والوں کو زندہ جلایا جاتا ہے۔''[15]

یورپی اقوام اگرچہ ہندوستان سے رخصت ہو چکی ہے مگر وہ ہمیشہ یہاں کے مقامی ذہنوں پر غلبہ قائم رکھے گی۔کبھی کسی نظریے کی شکل میں، کبھی امداد کی شکل میں، کبھی کسی ریسرچ کی آڑ میں کبھی تاریخی بازیافت کے لیے ہاف مین جیسے کردار تو کبھی بے شمار مغرب زدہ ہمارے اپنے بھائی بند موجود رہیں گے۔انھیں ترقی پذیر دنیا کو غلام بنانے کے لیے کسی بارود اور بم کی ضرورت نہیں ہے۔ان کے شکنجے ہمیشہ سے ہی مضبوط رہے ہیں۔''کوئی مانے یا نہ مانے لیکن چٹی چمڑی، گورے بدن کا جادو بڑا ظالم ہے۔یہی دراصل کالا جادو ہے۔سفید بندے کو دیکھ کر دل کے اندر کہیں گھونسا سا پڑتا ہے۔''[۱۶]

غلام باغ میں کرداروں، مکالموں اور واقعات کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج کا انسان بظاہر آزاد ہے۔مگر وہ ذہنی طور پر بھی محکوم ہی ہے۔آج بھی وہی ذہنی خلفشار مضطرب پن اور انتشار کی کیفیت موجود ہے۔

حفیظ خان نے ''منتارا'' میں استعماری طاقتوں کا سیاست کے میدان میں نفسیاتی حربوں کے ذریعے اپنی مرضی کی بساط بچھانے سے لے کر منطقی انجام تک کے تمام استعماری رویے ناول کے بیانیے میں سمو دیئے ہیں۔استعمار کار ہاتھ وہ خفیہ ذرائع ہیں جن میں بعض قریبی ساتھی اور گھر والے بھی شام ہوتے ہیں۔جن کی مدد سے یہ

طاقتیں اپنی مرضی کے بادشاہ، وزیرِ منتخب کرتی ہیں۔ ناول نگار نے پوری سچائی سے انسانی نفسیات کی ان کمزوریوں کو بیان کیا۔ جن کی مدد سے یہ نادیدہ قوتیں انسان کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتے ہیں۔ خفیہ طور پر ان کا بھی کنٹرول پاور ہوتا ہے۔ جن کا مقصد مشن ہے۔ ان کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ صرف کوڈ نمبر ہوتے ہیں۔ اس ناول میں deep state theory کی مدد سے استعماری بیانیہ تشکیل دیا گیا ہے۔ استعماریت کی مضبوطی کے لیے صحافت، خفیہ ایجنسیاں اور سیاسی لیڈر ایسی مثلث ہیں جن میں اتار چڑھاؤ کے لیے بڑی پلاننگ سے شباب اور شراب کو داخل کیا جاتا ہے۔ ناول شروع سے آخر تک اسی استعماری دائرے میں حرکت کرتا نظر آتا ہے۔ دشمن کے خفیہ وار اور سازشوں کے ساتھ اب تو دوست ملک بھی اپنی مرضی کے معاشی، سیاسی اور تجارتی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے بھی استعماری رویے اپناتے ہیں۔

''جب کبھی کسی پردے کے عقب سے حکومت چلائی ہوتو بہت سے ڈمی صدور، وزرائے اعظم اور وزرائے اعلیٰ اس مملکت کا مقدر رہے ہیں.....کون سا سیاست دان اقتدار میں سے کیا چاہتا ہے۔ اِس کا ادراک اسٹیبلیشمنٹ کے بادشاگروں کو بھی خوب رہا تھا۔''۱۷

استعماری رویوں کی ترویج کے لیے ملٹی نیشنل ایجنسیاں مخصوص ذہنوں اور خوب صورت جسموں کا چناؤ کر کے انھیں ضروری تربیت کے بعد مختلف ممالک میں طبقاتی تفاوت پیدا کرنے، سیاسی جماعتوں میں مفاد پرستی اور لابینگ کے ساتھ ساتھ نفسیاتی جنگ کو ہر قیمت پر یقینی بنانے کے مشن پر مامور کیا جاتا ہے۔ ناول کے بیانیے میں نائلہ کا کردار اسی طرزِ عمل کی مثال ہے۔ اس تنظیم کے آلہ کاروں، عہدیداروں اور ہیڈ آفس کی کسی کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔

''زینہ'' میں خالد فتح محمد نے استعماری بیانیے کی ایک نئی شکل متعارف کروائی ہے۔ تعلیم جسے ذہن سازی اور شعوری زیست سمجھا جاتا ہے۔ مگر موجودہ مادیت کے دور میں علم ایک جنس بن کر رہ گیا ہے۔ آج تعلیم و تربیت کے پیمانوں کی بجائے تجارت کا پیمانہ بنتی جا رہی ہے، اور نظامِ تعلیم صرف تجربات کی آماج گاہ بن کر رہ گئی ہے۔ استعماری طاقتیں کسی بھی قوم، ملک اور معاشرے کو ذہنی اور عملی سطح پر مفلوج بنانے کے لیے پہلا وار نظامِ تعلیم پر ہی کرتی ہیں۔ موجودہ نظامِ تعلیم صرف پڑھی لکھی افرادی پیداوار مہیا کر رہا ہے۔ صارفیت نے کونسلینگ کے ذریعے تعلیم کو بھی برینڈ بنا کر رکھ دیا ہے۔ ناول کے بیانیے میں اس کی مستحکم صورتیں نظر آتی ہیں۔

''تعلیم کے معیار بدل گئے ہیں اور لوگ علم کی بجائے نمبروں کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور نصاب میں بھی منطق کے بجائے بے دلیلی در آئی تھی اور جو پڑھایا جا رہا تھا در اصل تعلیم کا حصہ نہیں۔''۱۸

آزادیِ اظہار کے لیے صحافت جو معاشرے کا مثبت کردار ہوتا ہے۔ استعماریت کا شکنجہ بھی صحافت کو داغ دار کر رہا ہے۔ ہر چیز کا ایک Usage ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں آزادی اظہار کو بھی استعمار کار بنایا جا رہا ہے۔ اسٹیبلیشمنٹ خود پس پردہ رہ کر اپنی مرضی کے سیاسی ہتھکنڈے اور عوام کی ذہن سازی کے لیے میڈیا کو سب سے زیادہ استعمال کرتی ہے۔ اُنھی کی ایما پر میڈیا اصل حقائق کی بجائے صرف وہی پیش کرتا ہے جو خفیہ اداروں کی مفاد پرستی

سے وابستہ ہو۔میڈیا اور اخبارات کے اس رویے پر گہری ناول کے بیانیے میں نظر آتی ہے۔

''ایسے سیاست دانوں کی ایک نئی کھیپ تیار کی جارہی تھی جن کا تعقل معمولی اور وژن نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ انھیں ملک کے معاملات سنبھالنے کی تربیت دے رہے تھے۔ پھر سیاسی آڑ میں جہاد کے نام پر نوجوانوں کا کاروبار ہونے لگا اور ان کی قیمت ادا کی جانے لگی۔''۱۹

میڈیا ہاؤس اپنی ریٹنگ میں اضافے کے لیے اندھا دھن لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے Breaking News دے دے کر، ان خفیہ ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر ناچ رہے ہیں جو خبروں کے نام پر عوام کو اصل حقائق سے ہٹا کر ابہام میں ڈال رہے ہیں۔ یہ نیٹ ورک پورے ملک میں پھیلتا جا رہا ہے۔ استعماری ہاتھ میڈیا کے ذریعے در پردہ احکامات دیتے اور عمل درآمد بھی کرواتے ہیں۔ صحافیوں کو لگژری مراعات اور شہرت سے نوازا جا رہا ہے۔ کون کیا کر رہا ہے اور ترقی کے لیے کس کا زینہ استعمال کر رہا ہے۔ یہ سارے ابہام اس ناول کے بیانیے میں طنزیہ شکل میں نظر آتے ہیں۔ انسان کی ہوس ہی انسان سے بڑے بڑے کام لیتی ہے۔ جو ہمیشہ خود نمائی اور خوشامد کا متلاشی اور متمنی رہا ہے۔ اِسی ہوس نے انسان کو قیدی بنا رکھا ہے۔ متوازنیت کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے انسان کی نظریاتی، مفاد پرستی اور ہوس کی قید کو پرندوں کی قید کی مانند قرار دیا ہے۔ علامتی طور پر منصف نے ناول میں پرندوں کی ناپید ہوتی نسل کو افزائش نسل کے فاختہ گھر کی تشکیل کو معاشرے میں مٹتی ہوئی اقدار اور نئے آدم کی تلاش کو نیا وژن دے کر رد استعماری بیانیے کی بنیاد رکھی ہے۔ مابعد نوا؟ بادیاتی بیانیہ نوا؟ بادیات کے تحت تشکیل پانے والے معاشروں میں ادبی متون کی تفہیم کا ڈسکورس ہے۔ جن کا اساسی موضوع گمشدہ اور مٹتے ہوئے تہذیبی و ثقافتی مقامیت کی بازدید ہے۔ جب انگریزوں نے برصغیر کو اپنے اقتدار میں شامل اور برصغیر کے پورے خطے کو اپنی نوآبادی بنایا تو نئی اقوام کے نئے رسم و رواج تشکیل پانے لگے۔ مقامیت کا ثبوت ثقافت کی تشکیل کے مضبوط زاویے مذہب زبان، رسم و رواج، اساطیر، توہمات وتعصّبات، مقامی شادی بیاہ کی رسمیں، تہوار، مقامی کھانے، لباس، شعر و ادب اور زندگی کے مسائل کو خاص نقطۂ نظر سے پیش کرنا ہے۔

بیانیہ اور ہر عہد کا ڈسکورس ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ تخلیق کار اپنی تخلیقی اُپج سے جس عہد کے ڈسکورس کو چھیڑے گا اس کے اثرات اور ماحول سے مطابقت بیانیے میں ڈھلتی جائے گی۔

حواشی:

۱۔ طاہرہ اقبال، گراں، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء) ص ۱۳۷

۲۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۳۔ ایضاً، ص ۲۰

۴۔ تارڑ، مستنصر حسین، خس و خاشاک زمانے، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء) ص ۴۷۷

۵۔ ایضاً، ص۵۰۹
۶۔ صفدر زیدی، چینی جو میٹھی نہ تھی، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۶ء) ص ۱۳۶، ۱۳۵
۷۔ حسن منظر، حَبس، (کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۶ء) ص۱۸۳
۸۔ ایضاً، ص۲۸۶
۹۔ وحید احمد، زینو، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۳ء) ص۱۴۹
۱۰۔ ایضاً، ص۱۵۹
۱۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، قلعہ جنگی، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص ۴۷۔۵۲
۱۲۔ اطہر بیگ، مرزا: انٹرویو، رخسانہ بی بی، بمقام جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۴ مارچ ۲۰۰۸ء، وقت ۱۲:۱۰ دوپہر
۱۳۔ رخسانہ بی بی، غلام باغ میں کارفرما تاریخی تصورات، مشمولہ: معیار، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۳ء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ص۲۳۳
۱۴۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، نوآبادیاتی صورتِ حال، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، مرتبین: ڈاکٹر ضیاء الحسن، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، لاہور: اورینٹل کالج ۲۰۰۸ء، ص۲۷۰
۱۵۔ سفیر حیدر، سید، قیدی پرندوں کا اِضطراب مشمولہ: ماہِ نو، شمارہ: جون ۲۰۰۹ء، لاہور: ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرونک میڈیا اینڈ پبلیکیشن، ص۷۹
۱۶۔ اطہر بیگ مرزا، غلام باغ، ص۱۷
۱۷۔ حفیظ خان، منتارا، (راولپنڈی: صریر پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء) ص۸۷
۱۸۔ خالد فتح محمد، زینہ، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص۳۸
۱۹۔ ایضاً، ص۲۱۶

مآخذ

۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، خس و خاشاک زمانے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء
۲۔ تارڑ، مستنصر حسین، قلعہ جنگی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
۳۔ حسن منظر، حَبس، کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۶ء
۴۔ حفیظ خان، منتارا، راولپنڈی: صریر پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء
۵۔ خالد فتح محمد، زینہ، لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء
۶۔ صفدر زیدی، چینی جو میٹھی نہ تھی، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۶ء
۷۔ وحید احمد، زینو، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۳ء